© rasailojaraid.com

مولانا محمد جعفر پھلواروی

عذابِ الٰہی کا مطلب کیا ہے؟

ہوش سنبھالنے کے بعد سے اب تک اپنی عمر (۷۴ سال قمری) میں مَیں نے بہتیرے آفاتِ ارضی و سماوی دیکھے اور ایک ہی قسم کے حادثے بار بار بھی دیکھے۔ طوفان باد و باراں، زلزلے، سیلاب وبائیں وغیرہ سب کچھ دیکھا اور ہمیشہ ان حوادث کے متعلق ایک ہی بات سنتا رہا کہ "یہ عذابِ الٰہی ہے"۔ ایسی بیسیوں باتیں ہیں جو سننے میں آتی رہیں۔ مگر ان پر غور و فکر کرنے کی نوبت نہیں آئی۔ لیکن دسمبر ۱۹۷۴ء میں سوات میں جو زلزلہ آیا اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کراچی کے ایک محترم مخلص نے دریافت کیا ہے:

.... کیا یہ ان پر خدا کا عذاب نازل ہوا ہے؟ اگر بالفرض محال ایسا ہی ہے تو ان سے اظہار ہمدردی کرنا کیا بپھرے ہوئے خدا کو مزید ناراض کرنے کے مترادف نہیں؟ اگر اس قسم کے توہم میں مبتلا ہو کر ان کی مدد نہ کی جائے تو اس زمین پر انسانیت کا کیا حشر ہو؟ - اگر ان واقعات کو انسانی اعمال سے غیر متعلق قرار دیا جائے تو قرآن کریم کے متعدد اور واضح بیانات کی کیا تاویل کی جائے؟ ....

میں جہاں تک غور کر سکا ہوں۔ بات یوں معلوم ہوتی ہے کہ نبوت کا دروازہ بند ہوا تو اس کے ساتھ دو اور چیزیں بھی ختم کر دی گئیں۔ ایک معجزہ اور دوسرے عذاب۔ معجزہ اس وقت پیشِ نظر نہیں تاہم دو ایک باتیں یاد رکھنی چاہییں۔ اولاً تو یہ آیت قرآنی ہے:

وما منعنا ان نرسل بالآیٰت الا ان کذب بھا الاولون ..... (۱۷:۵۹)

ہمیں (فرمائشی) معجزے بھیجنے سے جس چیز نے روک دیا ہے وہ یہ ہے کہ پہلے کے لوگ (اپنے فرمائشی معجزے دیکھنے کے بعد بھی) ان کی تکذیب کرتے رہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ معجزے کا تعلق نبی سے ہوتا ہے اور جب نبوت ختم ہو گئی تو اس کے ساتھ معجزات بھی ختم ہو گئے۔ - اب اگر کہیں خرقِ عادت قسم کی کوئی چیز نظر آئے تو اسے آپ کرامت، کشف، تصوف اور استدراج (اگر غیر مومن سے ظاہر ہو) اور جو جی چاہے کہہ لیجیے لیکن

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اسے معجزہ نہیں کہہ سکتے۔ اس لیے کہ معجزے میں تحدی ہوتی ہے اور دوسرے خرقِ عادت میں نہ تو تحدی ہوتی ہے اور نہ وہ کسی ایک فرد کے ساتھ مختص ہوتا ہے۔ ایسے خرقِ عادت کے لیے تو مسلم و مومن ہونا بھی ضروری نہیں۔ سادھو اور بازی گر بھی اس قسم کے خرقِ عادات دکھا سکتے ہیں۔ مزید برآں معجزہ سراسر وہبی ہوتا ہے اور خرقِ عادت کسبی بھی ہوتا ہے اور وہبی بھی۔ مختصر یہ کہ معجزہ نبوت کے خاتمے کے ساتھ ہی ختم کر دیا گیا۔

ٹھیک اسی طرح ختم نبوت کے ساتھ ختم عذاب بھی ہو گیا۔ معجزات ختم ہو کر صرف کرامات یا استدراج رہ گیا۔ ٹھیک اسی طرح عذاب کا سلسلہ ختم ہو گیا اور ایک چیز باقی رہ گئی جسے قرآن بأساء، ضَرَّاء، ابتلاء اور فتنة کہتا ہے۔ عذاب اور بأساء و ضراء میں جو فرق ہے اسے پیشِ نظر رکھنے سے اصل مسئلے کو سمجھنے میں بڑی مدد ملے گی۔ دونوں کا فرق یہ ہے:

۱۔ ہر نبی کے ساتھ قدرتِ الٰہی کا یہ اہتمام رہا ہے کہ اس کا پیغام سن کر اس کے مخاطب امتی یا تو ایمان لائے یا کفر و انکار پر اڑے رہے۔ پھر آخری نتیجہ یہ ہوا کہ اہل ایمان بچا لیے گئے اور پوری امت کے تمام منکرین ایسے ہلاک و برباد ہوئے کہ ان کا نام و نشان بھی نہ باقی رہا۔ اسی ہلاکت کا دوسرا نام عذاب ہے جس کے بعد سنبھلنے کا کوئی موقع نہیں رہا۔ غرض یہ ہے کہ عذاب صرف کفار و منافقین پر آتا ہے اور انھیں ہمیشہ کے لیے مٹانے کی غرض سے آتا ہے اور یہ قدرت کا آخری فیصلہ ہوتا ہے[۱]۔ بخلاف اس کے بأساء اور ضراء (بدحالی و نقصان) ایک ایسی آزمائش، فتنہ اور ابتلا ہے کہ اہلِ ایمان اور اہلِ کفر دونوں ہی اس کی لپیٹ میں آجاتے ہیں۔ یہ آخری چارۂ کار نہیں ہوتا۔ عبوری ہوتا ہے اور بار بار ہوتا ہے۔ اس کے مقصد کو قرآن یوں بیان فرماتا ہے:

وما ارسلنا فی قریۃ من نبی الا اخذنا اھلھا بالبأساء والضراء لعلھم۔

---

[۱] قرآن کریم میں کئی جگہ ٹل جانے والے بأساء و ضراء کو بھی عذاب کہا گیا ہے مثلاً:

فلما کشفنا عنھم العذاب اذا ھم ینکثون (۴۳: ۵۰)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یَضَّرَّعُونَ (۷: ۹۴)

ہم نے جس بستی میں بھی کوئی نبی بھیجا وہاں کے باشندوں کی سختی اور دکھ بھیج کر گرفت کی تاکہ وہ عاجزی اختیار کریں۔

اس سے ملتا جلتا مضمون ۶: ۴۲-۴۳ میں بھی ہے۔ ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ بأساء و ضراء سے غرض یہ ہوتی ہے کہ لوگ سرکشی کو چھوڑ کر مالکِ حقیقی کی طرف رجوع کریں۔ اگر یہ فیصلہ کن اور آخری چارۂ کار ہوتا تو تضرّع اختیار کرنے کا سوال ہی نہ پیدا ہوتا جیسا کہ اگلی آیت سے واضح ہوتا ہے کہ:

ثُمَّ بَدَّلْنَا مَكَانَ السَّيِّئَةِ الْحَسَنَةَ حَتّٰى عَفَوْا وَّقَالُوْا قَدْ مَسَّ اٰبَآءَنَا الضَّرَّآءُ وَالسَّرَّآءُ فَاَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ○ (۷: ۹۵)

پھر ہم دکھ بدل کر اس کی جگہ سکھ لے آئے یہاں تک کہ وہ بڑھتے رہے اور کہنے لگے کہ دکھ اور سکھ تو ہمارے باپ دادوں کو بھی پہنچتے رہے ہیں۔ (یعنی یہ اتفاقی حوادث ہیں۔ خدا سے یا ہمارے اعمال سے اس کا کوئی تعلق نہیں) لہٰذا ہم نے ان کو اس طرح اچانک پکڑ لیا کہ انھیں پتا بھی نہ چلا۔

اس آیت سے واضح ہوتا ہے کہ بأساء و ضراء کے بعد بھی سنبھلنے کا موقع ملتا ہے اور سنبھلنے کے بعد پھر بگڑ جائیں تو بأساء و ضراء پھر آتا ہے۔ یعنی یہ بار بار بھی آسکتا ہے جیسا کہ قومِ فرعون پر آتا رہا:

فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الطُّوْفَانَ وَالْجَرَادَ وَالْقُمَّلَ وَالضَّفَادِعَ وَالدَّمَ اٰيٰتٍ مُّفَصَّلٰتٍ ○ (۷: ۱۳۳)

لہٰذا ہم نے ان پر طوفان، ٹڈیوں، جوؤں، مینڈکوں اور خون کی الگ الگ نشانیاں بھیجیں[1] اگر سنبھل گئے تو پھر انعامات سے نوازا جاتا ہے ورنہ چند مزید موقعوں کے بعد ہلاک کر دیا جاتا ہے۔

۲۔ دوسرا فرق یہ ہے کہ عذاب دنیا میں ہوتا ہے جو تمام منکروں کو مٹا کر رکھ دیتا ہے اور آخرت

---

[1] اس سے پہلے ۷: ۱۳۰ میں قحط اور پھلوں کی کمی کا بھی ذکر ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں بھی ہوگا جیسا کہ ارشاد ہے :

..... ولھم عذاب الیم فی الدنیا والاخرۃ (۹ : ۷۴)

بخلاف اس کے ضرأ و باسا، کا تعلق صرف دنیا سے ہے کیونکہ یہ تنبیہ کے لیے ہوتے ہیں تاکہ توبہ و رجوع ہو لیکن آخرت میں اس کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

۳۔ تیسرا فرق یہ ہے کہ بأسا، وضرا ایسی ابتلائیں ہیں جن پر افسوس کرنا بجا اور غمگین ہونا روا ہے لیکن عذاب سے جو لوگ ہلاک ہوتے ہیں ان پر اظہار افسوس کی بھی اجازت نہیں۔

سیدنا شعیبؑ کی قوم جب زلزلے سے ہلاک ہوئی تو آپؑ نے فرمایا :

..... فکیف اسیٰ علیٰ قوم کٰفرین ہ (۷ : ۹۳)

پھر میں منکر لوگوں (کی ہلاکت) پر افسوس کیسے کروں۔

سیدنا موسیٰؑ کو اور خود آنحضورؐ کو تو ہلاک ہونے والوں کی ہلاکت سے پہلے ہی افسوس کرنے سے روک دیا گیا :

..... فلا تأس علی القوم الفٰسقین ہ (۵ : ۲۶)

(اے موسیٰ !) فاسق لوگوں (کی ہلاکت) پر افسوس نہ کرنا۔

...... فلا تأس علی القوم الکٰفرین ہ (۵ : ۶۸)

(اے محمدؐ) منکر لوگوں (کی ہلاکت) پر افسوس نہ کرنا۔

بخلاف اس کے ضرأ و بأسا، ایک ایسی ابتلا ہے کہ اس میں ہلاک ہونے والوں پر (افسوس) اور پسماندوں کے ساتھ مواساۃ (ہمدردی) نہ فقط جائز بلکہ ضروری ہے اور یہ ہمدردی ہرگز "بھپرے ہوئے خدا کو ناراض کرنے کے مترادف" نہیں بلکہ اسی میں اس کی رضا ہے۔ بلکہ ترکِ ہمدردی اللہ کی ناراضی کا سبب ہے۔

اب یہاں ایک ضروری نکتہ پیش نظر رکھنا چاہیے اور وہ یہ ہے کہ قدرتی حوادث محض اتفاقی حوادث نہیں ہوتے جو کسی زبردست ارادے کے بغیر خود بخود وقوع میں آجائیں۔ جسے آپ عذاب کہتے ہیں وہ بھی بداعمالیوں کے نتیجے میں آتا رہا۔ اس پر پورا قرآن شاہد ہے دلائل پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔ رہیں آزمائشی تنبیہیں یعنی ضرار و بأسا، تو وہ بھی محض اتفاقی قدرتی حوادث

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نہیں۔ اس میں بھی ارادۂ الٰہی کارفرما ہوتا ہے اور اعمال سے اس کا بھی تعلق ہوتا ہے۔ ۹۵:۷ کی جو آیت اوپر مذکور ہوئی ہے اس سے صاف واضح ہوتا ہے کہ بعض امتوں پر تنبیہی آزمائش آنے کے بعد جب اچھے حالات پیدا ہوئے تو لوگوں نے نہ تو ضرا سے تضرع و عاجزی کا سبق سیکھا اور نہ سرا پر شکر ادا کیا۔ بلکہ دونوں کو اعمال سے غیر متعلق چیزیں سمجھ کر کہنے لگے کہ یہ تو اتفاقی حادثات ہیں جن سے ہمارے باپ دادا بھی دوچار ہوتے رہے ہیں۔

ہمیں اس معاملے میں جو شبہات ہوتے ہیں اس کا سبب اپنی عقلی نارسائی ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ دکھ اور خوشی کا کوئی تعلق ہمارے اعمال سے نہیں اور یہ ایسے حوادث و واقعات ہیں جو از خود وجود میں آجاتے ہیں اور کسی "فعال لما یرید" کے ارادۂ سزا و جزا کو اس میں کوئی دخل نہیں۔ ان شبہات کے پیدا ہونے کا سبب وہ محدود اور ناقص پیمانہ ہے جو ہم نے پیدا کر لیا ہے۔ ہم اپنے دل میں سوچتے رہتے ہیں کہ "فلاں جگہ ہی یہ آفت کیوں آئی۔ دوسری جگہ کیوں نہ آئی جہاں آفت زدہ علاقے سے کہیں زیادہ برائی موجود ہے۔ اور بہتر تھا کہ سیدھے سادے مسلمانوں کی بجائے شہروں کے کلبوں، ناچ گھروں اور سینماؤں پر آفت آنی چاہیے تھی۔ وغیرہ وغیرہ"۔

اس قسم کے وسواس و خیالات جب دماغ میں آتے ہیں اور ہماری محدود و نارسا عقل ان سوالات کو حل کرنے سے قاصر رہتی ہے تو ہم صرف ایک توجیہ پیش کر کے اپنے آپ کو جھوٹی تسلی دے لیتے ہیں۔ اور وہ توجیہ یوں کرتے ہیں کہ "یہ سب اتفاقی حادثات ہیں اور اعمال سے ان کا کوئی تعلق نہیں"۔ دوسرے لفظوں میں یا تو ان حوادث میں کوئی غیبی قوت و ارادہ کارفرما نہیں یا اگر کارفرما ہے تو وہ اندھے کی لکڑی ہے جس میں نہ کوئی عدل ہے نہ حکمت۔ نہ نظم ہے نہ توازن۔ بس ایک اندھی قوت ہے جو بے سوچے سمجھے جو چاہتی ہے الٹا سیدھا کر گزرتی ہے۔ نعوذ باللہ من ذالک۔ ایسی باتوں کے صحیح تجزیے تک پہنچنا سردست انسانی دسترس سے باہر ہے۔ اس طرح کے ہزاروں سوالات ہیں جن کا حل انسان کی نارسا عقل نہیں پیدا کر سکی ہے۔

سوال یہ ہے کہ انسان کے پاس کون سی ایسی میزان ہے جس پر وہ مختلف آبادیوں کے اعمال کو تول کر یہ فیصلہ کر سکے کہ فلاں آبادی کے لوگ زیادہ برے ہیں اس لیے پہلے ان پر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور اس حد تک عذاب آنا چاہیے اور فلاں بستی کے لوگ ذرا کم برے ہیں اس لیے ان پر بعد میں اور قدرے کم عذاب نازل ہونا چاہیے۔ کوئی انسان ایسا نہیں جو اپنے دو دن کے بارے میں بھی یہ فیصلہ کر سکے کہ کل کا دن زیادہ قیمتی تھا یا آج کا؟ اور کون کون سا لمحہ کس کس لحاظ سے کتنا کم یا زیادہ قدر و قیمت رکھتا ہے۔ علاوہ ازیں ابھی اس کائنات کے ہزاروں مسائل ہیں جن کا کوئی حل انسان نہیں تلاش کر سکا۔ بے شمار حوادث ہیں جن کی حقیقت و کنہہ کو انسان ہنوز دریافت نہیں کر سکا:

کہ کس نکشود و نکشاید بحکمت ایں معما را

انسانی تلاش و جستجو تو جاری رہنا چاہیے لیکن مکمل دریافت حقیقت سے پہلے کوئی فیصلہ صادر کرنا حماقت کے سوا کچھ نہیں۔ اس وقت ہمارا کام یہ نہیں کہ آفاتِ سماوی و ارضی کے بارے میں یہ فیصلہ کر کے بیٹھ جائیں کہ یہ غلط ہوا یا صحیح؟ یا اسے یہاں ہونا چاہیے یا وہاں؟ ہمارا یہ کام نہیں۔ ہمارے کرنے کا کام صرف یہ ہے کہ آفت آ چکنے کے بعد اب اسے رحمت میں کس طرح تبدیل کیا جائے۔

بلا شبہ حوادث دیکھ کر سبھوں کو توبہ و استغفار اور اصلاح اعمال کرنا چاہیے اور اسی کو لعلھم یضرعون کہا گیا ہے۔ تضرع صرف زبان سے توبہ و استغفار کرنا اور اظہارِ عاجزی کرنا ہی نہیں۔ خدا کی ان گنت نعمتوں سے فائدہ حاصل کرنا، مصیبت زدوں کو آفتوں سے نکالنا اور ان کے حوصلوں کو بلند رکھنا۔ آفات کے اندر سے خیر پیدا کرنا وغیرہ بھی تضرع ہی کا تقاضا ہے۔ اور اگر نیت درست ہو اور ارادۂ استحصال نہ ہو تو آفات کے بعد جو نقصان ہوتا ہے اس سے کہیں زیادہ فائدہ حاصل ہو جاتا ہے۔ قرآن اس مضمون کو یوں ادا فرماتا ہے: ...... ان یعلم اللہ فی قلوبکم خیرا یؤتکم خیرا مما اخذ منکم و یغفرلکم ...... (۸: ۷۰)

(اے رسول اپنے قیدیوں سے کہہ دو کہ) اگر اللہ تمہارے دلوں میں نیکی کو دیکھے گا تو جو کچھ تم سے لے لیا گیا ہے اس سے بہتر تمہیں عطا فرمادے گا اور تمہیں مغفرت سے بھی نوازے گا۔

جب یہ صورتِ حال ہو تو کسی آفت (ضرا و بأساء) کو "عذاب" نہیں سمجھنا چاہیے بلکہ ایک

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ایسی ابتلا تصور کرنا چاہیے جس میں خیر و شر کے دو گونہ پہلو موجود ہیں۔ اگر ہم نامناسب طرزِ عمل اختیار کریں تو وہی عین شر ہو سکتا ہے اور اگر صبر، حکمت، محنت اور نیک ارادے سے کام لیں تو وہی آزمائش ہمارے لیے ہمہ تن خیر بن سکتی ہے۔ زلزلہ بے شک ایک بڑی سخت آزمائش ہے۔ اس میں جان و مال کا خاص نقصان ہو جاتا ہے لیکن مجموعی حیثیت سے اس میں رحمت و برکت کا پہلو بھی ہوتا ہے۔ قرآنی ارشاد ہے:

اذا زلزلت الارض زلزالہا ہ و اخرجت الارض اثقالہا ہ

جب زمین میں زبردست زلزلہ آئے گا اور زمین اپنے "اثقال" کو باہر کر دے گی۔

یہاں "اثقال" سے محض کیچڑ یا ریت وغیرہ مراد نہیں۔ زمین کے سارے پوشیدہ خزائن (معدنی خزانے) اثقال ہی ہیں جن کو زمین چند جھٹکوں میں اُگل دیتی ہے یا ان کا سراغ مل جاتا ہے۔ سوات اور ہزارہ کے زلزلے نے بلاشبہ بڑی تباہی مچائی ہے لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اسی زلزلے نے پورے آفت زدہ علاقے کو ایک ایسی تعمیرِ نو کی راہ پر ڈال دیا ہے جس کا پہلے تصور بھی موجود نہ تھا۔ مکانات، سڑکیں، تعلیم گاہیں، شفاخانے، سیرگاہیں، بجلی، پانی، گیس، کارخانے، غرض تمدن جدید کی ہر چیز منصۂ شہود پر جلد آ جانے کا قوی امکان پیدا ہو گیا ہے اور عین ممکن ہے کہ بعض ایسے معدنی ذخائر بھی دریافت ہو جائیں جن سے ہم اب تک لاعلم ہیں۔ مولانا رومی نے اس حقیقت کو یوں بیان کیا ہے:

ہر بنائے کہنہ کآباداں کنند اوّل آں تعمیر را ویراں کنند

غرض کسی دوزخ کو بہشت بنانا صرف ان حوصلے والے انسانوں کا کام ہے جو کسی آزمائش سے ناامید ہو کر اپنے ہاتھ پاؤں توڑ کر نہیں بیٹھ جاتے بلکہ کمر کس کر شر کی تہوں سے خیر و برکت پیدا کر لیتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں بأساء وضراء کو فیصلہ کن عذاب سمجھ کر مایوس نہیں ہو جاتے۔ ان کے سامنے آگ ہوتی ہے تو وہ اس سے گھر پھونک ڈالنے کا کام نہیں لیتے بلکہ کھانے پکانے کا بہترین مصرف لیتے ہیں۔ اینٹوں کا بھٹا پکاتے ہیں، دھاتوں کو گلا کر سانچوں میں ڈھال لیتے ہیں۔ مختصر یہ ہے کہ ہر بات اور تمام آفات میں خیر و شر کے دونوں پہلو موجود ہوتے ہیں۔ اب یہ انسان کا کام ہے کہ وہ اس سے تعمیری کام لے یا تخریبی۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہ نکتہ بھی فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ بدحالی کی طرح خوش حالی اور دکھ کی طرح سکھ بھی ابتلاء و آزمائش ہی ہوتا ہے۔ یعنی فقط ضراء و بآساء ہی نہیں سراء بھی امتحان ہوتا ہے۔ قرآن میں ہے:

فاما الانسان اذا ما ابتلٰہ ربہ فاکرمہ و نعمہ فیقول ربی اکرمن ۝ و اما اذا ما ابتلٰہ فقدر علیہ رزقہ فیقول ربی اھانن ۝ (۱۵، ۱۶ : ۸۹)

انسان کا یہ حال ہے کہ اس کا رب اسے آزماتا ہے اور اسے انعام و اکرام سے نوازتا ہے تو وہ کہنے لگتا ہے کہ میرے رب نے مجھ پر بڑا کرم کیا۔ لیکن جب وہ اسے آزماتا ہے اور اس پر رزق تنگ کر دیتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ میرے رب نے میری بڑی اہانت کی۔

دیکھیے اللہ تعالیٰ دونوں حالتوں کے لیے ابتلاء کا لفظ لاتا ہے۔ یعنی دونوں کو آزمائش و امتحان قرار دیتا ہے لیکن ایک کو تو انسان اکرام سمجھتا ہے اور دوسری کو اہانت تصور کرتا ہے حالانکہ اسے سکھ میں شاکر اور دکھ میں صابر ہونا چاہیے اور دونوں ہی حالتوں کو ابتلا سمجھ کر ترساں و لرزاں رہنا چاہیے کہ کہیں دونوں کو اپنی اپنی قدروں کے مطابق نبھانے میں کوتاہی نہ ہو جائے۔ خصوصاً دکھ میں اگر قدرت کے گلے شکوے، ناشکری اور مایوسی طاری ہونے لگیں تو اس حالات کو بدلنے کی توفیق، مردانہ وار مقابلے کا دم خم اور تعمیر نو کا جذبہ ختم ہو جاتا ہے۔ ورنہ:

اگر ہے جذبۂ تعمیر زندہ تو پھر کس بات کی ہم میں کمی ہے

ہم تکوینی حوادث (NATURAL PHENOMENA) کی حکمتوں اور باریکیوں کو پوری طرح سمجھنے کی اہلیت نہیں رکھتے لیکن ان حوادث کو سمجھنا دشوار نہیں جو معاشری خرابیوں کے نتیجے میں پیدا ہوتے ہیں۔ اخلاقی، تعلیمی، سیاسی، معاشی خرابیوں کا کوئی نہ کوئی نتیجہ ضرور ہوتا ہے۔ کبھی طبقاتی کشمکش، کبھی جنگ و خوں ریزی۔ کبھی مصنوعی قحط اور گرانی، کبھی خوف و بدامنی۔ کبھی ذہنی اضطراب، کبھی دلی بے چینی کی وجہ سے طرح طرح کے عوارض وغیرہ۔ یہ تمام چیزیں بآساء و ضراء ہیں اور ان کا علاج ہمارے بس میں ہے بلکہ ان کو سراء میں تبدیل کر دینا بھی ہمارے اختیار کے اندر ہے۔ ان کو فیصلہ کن عذاب سمجھنا تضرّع نہیں۔ تضرّع کا اصلی تقاضا حالات کو بدل کر خرابیوں پر قابو پانا ہے نہ کہ ہاتھ پاؤں توڑ کر رونے بیٹھ جانا۔

© rasailojaraid.com